خورشید احمد ندیم

دیو بند کانفرنس اور مذہبی سیاست

دیو بند کانفرنس کے بارے میں عمومی رائے یہی ہے کہ یہ ایک مخصوص مذہبی عصبیت رکھنے والوں کا اجتماع تھا جن کے پیشِ نظر اپنی سیاسی قوت کا اظہار تھا۔ تاہم، ہمارے نزدیک، چند اور پہلوؤں سے بھی اس اجتماع کا مطالعہ کیا جانا چاہیے۔ ان میں سب سے اہم مذہبی عصبیت اور عملی سیاسی حقائق کا تعلق ہے۔ ہمارے ہاں یہ وہ مسئلہ ہے جس کے بارے میں مذہبی جماعتیں ایک عرصہ سے ابہام کا شکار ہیں۔ وہ ان دونوں کے باہمی تعلق کو درست تناظر میں نہیں دیکھ سکیں جس کے باعث ملکی سیاست میں ان کا عملی کردار دن بدن کم ہوتا جا رہا ہے۔

دیو بند ہماری تاریخ میں ایک مذہبی فکر کا عنوان ہے اور ایک سیاسی موقف کا بھی۔ مذہبی اعتبار سے یہ تصوف و حنفیت کے اس امتزاج کا نام ہے جو اپنا تعلق اس روایت سے جوڑتا ہے جس کے اہم سنگِ میل شیخ احمد سرہندی، شاہ ولی اللہ، سید احمد بریلوی اور امداد اللہ مہاجر مکی ہیں۔ سیاسی اعتبار سے اس کا سب سے نمایاں حوالہ جمعیت علماے ہند ہے، اگرچہ ریشمی رومال کی تحریک، تحریکِ خلافت اور اس سے قبل ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کو بھی یہ اپنی سیاسی تاریخ کا تسلسل قرار دیتے ہیں۔ تقسیمِ ہند سے قبل یہ دونوں روایات ایک ساتھ آگے بڑھتی رہیں اور انھیں اس حوالے سے کوئی مشکل پیش نہیں آئی کہ جو لوگ ان کے مخاطب تھے، ان کے سیاسی مفادات ایک تھے۔ اس دور میں تقسیمِ کار کا ایک نقشہ سامنے آتا ہے جس کے تحت علمی و فکری پہلو سے دار العلوم دیو بند اور اس سے متعلق دینی مدارس کا ایک نظام متحرک تھا، سیاسی امور کو جمعیت علماے ہند کے فورم سے اٹھایا جاتا تھا اور تبلیغی و دعوتی کام مولانا محمد الیاس کے قافلے نے سنبھال لیا، جسے ہم تبلیغی جماعت کے نام سے جانتے ہیں۔ تقسیمِ کار کے اس نظام سے بھی مذہبی و سیاسی مطالبات کا تفاوت اتنا نمایاں ہو کر سامنے نہیں آیا جو ہمیں بعض دیگر معاصر مذہبی جماعتوں میں دکھائی دیتا ہے۔

تقسیمِ ہند نے سیاسی اعتبار سے معاملات کی نوعیت کو یکسر بدل دیا۔ اس حوالے سے دیو بندی عصبیت کے حامل تقسیم سے پہلے ہی دو حصوں میں بٹ چکے تھے۔ ایک کانگریس کا ہم نوا تھا اور دوسرا مسلم لیگ کا۔ قیامِ پاکستان کے بعد ایک فطری تقاضے کے تحت وابستگانِ دیو بند مستقل طور پر دو حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ پاکستان میں بسنے والوں نے اپنے لیے جمعیت علماے اسلام

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کا نام منتخب کیا جبکہ بھارت کے دیو بندی پرانے نام ہی سے منظّم رہے۔ مذہبی جماعتوں میں تقسیم کی یہ واحد مثال نہیں ہے۔ جماعتِ اسلامی سمیت بعض دیگر جماعتیں بھی اس عمل سے گزری ہیں۔ تقسیمِ ہند اتنا بڑا واقعہ تھا کہ اس کے بعد یہ جماعتی تقسیم ناگزیر تھی۔ اس تقسیم سے ان جماعتوں کے مذہبی موقف میں تو کوئی تبدیلی نہیں آئی، لیکن سیاسی اعتبار سے انہیں مجبوراً مقامی حالات کے تابع ہونا پڑا۔ بھارت میں بسنے والوں کو بہر حال، بھارت ہی کا وفادار ہونا تھا اور پاکستان میں رہنے والوں کو پاکستان کا۔

یہ معاملہ اتنا سنگین نہ ہوتا اگر پاکستان اور بھارت کے باہمی مفادات متصادم نہ ہوتے۔ مفادات کے اس تصادم نے دونوں اقوام کو ایک دوسرے کے بالمقابل لا کھڑا کیا۔ اب بھارت کے حق میں کلمۂ خیر کہنا پاکستان میں حبِ وطن کے برخلاف تھا اور یہی معاملہ بھارت کے شہریوں کے لیے تھا، قطعِ نظر اس بات سے کہ ان کا تعلق کس مذہب سے ہے۔ اس کی سب سے اہم مثال مسئلۂ کشمیر ہے۔ زیرِ نظر دیو بندی کانفرنس میں یہ مسئلہ پوری شان سے اٹھا۔ اس کانفرنس میں چونکہ بھارت سے آنے والے علما بھی شریک تھے، جن میں دار العلوم دیو بند کے مہتمم بھی شامل تھے، اس لیے یہاں اس رائے کا اعادہ نہ کیا جا سکا جو اس باب میں پاکستان کے دیو بندی حلقے رکھتے ہیں۔ اس وقت جو لوگ یہ موقف رکھتے ہیں کہ مسئلۂ کشمیر کا حل عسکری جدوجہد یا جہاد میں ہے، ان میں سب سے نمایاں گروہ خود کو دیو بند مدرسہ سے وابستہ قرار دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر حرکت الانصار اور جیشِ محمد۔ یہ لوگ اپنے اس کارنامے کو نمایاں طور پر بیان کرتے ہیں کہ وہ مقبوضہ کشمیر میں ہونے والی آزادی کی عسکری جدوجہد میں سب سے زیادہ شریک ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ یہ موقف ان دیو بندی حضرات کا نہیں جو ہندوستان میں ہیں۔ وہ یا تو اسے جہاد نہیں سمجھتے یا اس باب میں مکمل خاموشی اختیار کیے ہوئے ہیں۔

اگر ان کے حالات کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو اس طرزِ عمل پر تنقید کا کوئی جواز نہیں۔ ان کے پیشِ نظر ان کروڑوں مسلمانوں کا مفاد ہے جو اس وقت بھارت کے شہری ہیں۔ وہ کوئی ایسا موقف علانیہ اختیار نہیں کر سکتے جو بھارت کے قومی مفادات سے ٹکراتا ہو یا اس کے سرکاری موقف سے مختلف ہو۔ یہ لوگ بھارت کے شہری ہونے کے ناطے اپنی ریاست سے محبت رکھتے اور اس کے خیر خواہ ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں۔ اس توجیہہ کے باوجود یہ عملی حقیقت تو اپنی جگہ باقی رہتی ہے کہ مسئلۂ کشمیر پر پاکستان کے دیو بندی ایک رائے رکھتے ہیں اور بھارت کے دیو بندی دوسری...... جہاں تک مذہبی عقائد اور آرا کا تعلق ہے تو انھیں اس معاملے میں کسی طرح کا تفاوت محسوس نہیں ہوتا۔ یہ ممکن ہے کہ دار العلوم دیو بند کوئی فتویٰ دے اور یہاں کے دیو بندی اسے قبول کر لیں یا پاکستان کے کسی مدرسے، مثال کے طور پر بنوری ٹاؤن کراچی یا اکوڑہ خٹک کے دار الافتا کا فتویٰ بھارت کے دیو بندیوں کے لیے بھی قابلِ اتباع ہو۔ گویا مذہبی معاملات میں ایک رائے رکھنے کے باوجود وہ سیاسی معاملات میں مختلف الرائے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سیاسی تقاضے دوسرے ہیں اور علمی تقاضے دوسرے۔ اس

www.javedahmadghamidi.org
www.al-mawrid.org

کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ علمی اور سیاسی کام ایک پلیٹ فارم سے نہیں کیے جا سکتے۔ کیونکہ ان کے مطالبات ایک دوسرے سے مختلف، بلکہ بعض اوقات متصادم بھی ہو جاتے ہیں۔

ہمارے ہاں یہ مسئلہ ان لوگوں کو بھی درپیش ہے جنھوں نے علمی اور سیاسی کام ایک ہی نظم کے تحت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہر علمی کام ایک فکری عصبیت پر منتج ہوتا ہے۔ اب اگر کسی علمی کام کے ساتھ کسی اجتماعیت کو منظّم کرنے کی کوشش کی جائے گی تو وہ لازماً ایسے لوگوں ہی کا اجتماع ہو گا جو اس خاص علمی نقطۂ نظر کے حامل ہوں گے۔ اس کے برخلاف سیاسی کام کا تقاضا یہ ہے کہ وہ پوری قوم کو ساتھ لے کر چلے اور اس میں تمام نقطہ ہاے نظر کے لوگ خود کو اجنبی محسوس نہ کریں۔ یہ صلاحیت ایسی جماعت میں ہو سکتی ہے جو کوئی خاص علمی عصبیت نہ رکھتی ہو اور قومی دلچسپی کے امور پر لوگوں کو مجتمع کرنے کی علم بردار ہو۔ آج پاکستان میں کوئی مذہبی سیاسی جماعت ایسی نہیں جو اپنا مخصوص علمی و دینی پس منظر نہ رکھتی ہو۔ چنانچہ جب وہ اپنے دامن کو وسعت دینا چاہتی ہے تو یہ پس منظر اس کے پاؤں کی زنجیر بن جاتا ہے۔

مولانا فضل الرحمٰن بھی اس بات کے علم بردار ہیں کہ جمعیت علماے اسلام کسی خاص مذہبی فکر کی حامل جماعت نہیں، بلکہ ایک سیاسی پلیٹ فارم ہے جو پوری قوم کو ساتھ لے کر چلنا چاہتی ہے۔ چنانچہ وہ یہ کوشش کرتے ہیں کہ قومی و سیاسی امور ہی پر اظہارِ خیال کریں اور علمی و مذہبی موضوعات پر کوئی رائے نہ دیں۔ ممکن ہے کہ ان کا یہ دعویٰ درست ہو، لیکن کیا اس قوم کے دیگر طبقات یہ باور کرنے کے لیے تیار ہیں؟ یقیناً ایسا نہیں ہے۔ خود اس کانفرنس کا عنوان اس بات کا اعلان ہے کہ وہ اصلاً ایک خاص مذہبی پس منظر رکھنے والے لوگوں کا گروہ ہے۔ چنانچہ وہ کسی ایسے شخص کو اپنی جانب متوجہ نہیں کر سکتے جو بریلوی، شیعہ یا اہلِ حدیث فکر کا حامل ہے۔

اس بات کو ایک دوسرے پہلو سے دیکھیے۔ آج اہلِ تشیع اور بریلوی حضرات کے بارے میں جن جماعتوں نے انتہا پسندانہ موقف اختیار کیا ہے، انھوں نے دیو بندی مدارس ہی سے جنم لیا ہے۔ سپاہِ صحابہ کے بانی مولانا حق نواز جھنگوی نہ صرف دیو بندی تھے، بلکہ جمعیت علماے اسلام کے بھی عہدے دار تھے۔ چند ماہ پہلے کراچی میں دہشت گردی کا شکار بننے والے مولانا محمد یوسف لدھیانوی اس عہد کے دیو بندی علما میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ اہلِ تشیع کے بارے میں ان کا موقف وہی تھا جو سپاہِ صحابہ کا ہے۔ اس کے برخلاف جمعیت علماے اسلام جب ایک سیاسی فورم کی جگہ پر کھڑی ہوتی ہے تو وہ یہ موقف اختیار نہیں کرتی۔ دیو بند کانفرنس میں ایران سے ایک وفد شریک ہوا اور اس میں شیعہ سنی تقسیم کو مسلمان دشمنوں کی سازش قرار دیا گیا۔ سوال یہ ہے کہ اس تضاد کی کوئی توجیہ کیا ممکن ہے؟

اس طرح کے تضادات کا شکار صرف جمعیت علماے اسلام نہیں ہے، بلکہ ہر وہ جماعت ہے جو کسی خاص مذہبی عصبیت یا فکر کی بنیاد پر کھڑی ہے۔ کیا جناب طاہر القادری اپنے بریلوی پس منظر کو خود سے جدا کر سکتے ہیں؟ جماعتِ اسلامی نے خود کو شیعہ، سنی، دیو بندی، بریلوی کی تقسیم سے تو بلند کر لیا، لیکن کیا وہ مولانا مودودی کی فکر سے بھی دامن چھڑا سکتی ہے؟ یقیناً ایسا

نہیں ہے۔مولانا فضل الرحمٰن اگر یہ چاہتے ہیں کہ ان کی جماعت قومی جماعت بنے تو انھیں اس دیوبندی عصبیت سے باہر آنا ہوگا۔طاہر القادری صاحب اگر قومی رہنما بننا چاہتے ہیں تو انھیں اس شخصیت سے جان چھڑانا ہوگی جس سے لوگ ایک بریلوی عالم کی حیثیت سے متعارف ہیں۔قاضی حسین احمد صاحب اگر کسی قومی فورم کو وجود میں لانا چاہتے ہیں تو اس کا نام یقیناً جماعتِ اسلامی نہیں ہوسکتا۔کسی سیاسی کامیابی کے لیے ان لوگوں کو اپنے مخصوص مذہبی پس منظر سے باہر آنا ہوگا اور اصولاً اسی طرح سیاست کرنا ہوگی جس طرح مسلم لیگ یا پیپلز پارٹی کرتی ہیں۔سوال یہ ہے کہ کیا یہ ان حضرات کے لیے ممکن ہے؟

علمی کام اور سیاسی کام کے یہ تضادات ہیں، جن کو نہ سمجھنے کے نتیجے میں یہ مذہبی جماعتیں ہر طرح کے حربے استعمال کرنے کے باوجود، وہ سیاسی عصبیت حاصل نہیں کرسکتیں جو پیپلز پارٹی یا جناب نواز شریف کی قیادت میں مسلم لیگ کو حاصل ہوئی تھی۔ اس مسئلے کا حل حکمتِ عملی میں تلاش کرنے کے بجائے اگر یہ مذہبی جماعتیں اپنی ہیئتِ ترکیبی پر غور کرتیں تو انھیں اصل خرابی کے بارے میں معلوم ہوجاتا اور وہ اپنی توانائیاں کسی سعیِ لاحاصل پر صرف نہ کرتیں۔ یہ بات بھی اب تجربات سے ثابت ہو چکی ہے کہ سیاسی اور مذہبی عصبیتیں الگ الگ وجود رکھتی ہیں۔ایک آدمی اگر مذہبی اعتبار سے دیوبندی ہے تو یہ کچھ لازم نہیں کہ وہ سیاسی طور پر جمعیت علماے اسلام سے وابستہ ہو یا اگر کوئی شخص شیعہ ہے تو وہ ہر صورت میں تحریکِ جعفریہ کا رکن ہوگا۔ اگر ایسا ہوتا تو مسلم لیگ اور پیپلز پارٹی ہر طرح کی عصبیت سے محروم ہوتیں کیونکہ وہ کسی مذہبی عصبیت کی نمائندہ نہیں ہیں۔دیو بند کانفرنس میں کوئی شبہ نہیں کہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد شریک ہوئی تھی،لیکن اس سے یہ غلط فہمی پیدا نہیں ہونی چاہیے کہ یہ لوگ سیاسی اعتبار سے بھی وہی موقف رکھتے ہیں جو مولانا فضل الرحمٰن کا ہے۔

گزشتہ پچاس برسوں میں ہمارے ہاں بہت سے لوگوں نے یہ کوشش کی ہے کہ وہ کسی موجودہ مذہبی عصبیت کو سیاسی عصبیت میں بدل دیں یا پہلے ایک نئی مذہبی وعلمی عصبیت پیدا کریں اور پھر اسے سیاسی عصبیت میں تبدیل کر دیں۔ان سارے تجربات پر اگر نظر ڈالیں تو معاملہ وہی نظر آتا ہے کہ:

سامنے ڈھیر ہے ٹوٹے ہوئے پیمانوں کا

دیوبندی کانفرنس میں مسئلۂ کشمیر پر سامنے آنے والے اختلاف سے سیاسی اور عملی کام کے مختلف تقاضے ایک بار پھر نمایاں ہوگئے ہیں، اس لیے جب تک سیاسی اور علمی کام کے اس تفاوت کو نہیں سمجھا جائے گا اور جب تک لوگ یہ نہیں مانیں گے کہ سیاست اہلِ سیاست ہی کا کام ہے، ہمارے مذہبی لوگ سیاست کے صحرا میں بھٹکتے رہیں گے۔اس صحرا نوردی کا انجام کسی چشمِ بینا سے چھپا ہوا نہیں ہے۔وصالِ یار کا تو خیر کیا امکان، اس عاشقی میں عزتِ سادات بھی کب کی نیلام ہوچکی ہے۔

---

www.javedahmadghamidi.org
www.al-mawrid.org